POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 July 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 02-07-2026 • Price: 5/- • 8-14 July 2026 • Issue: 26 • Vol:85

۸تا۱۴ر جولائی ۲۰۲۶ء • شمارہ:۲۶ • جلد:۸۵

فارسی شاعری کا اثر اور اس کی تاثیر

پروفیسر شریف حسین قاسمی

شعر و شاعری اس معنی میں ضائع نہیں گئی کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمارے منابع میں ایسے متعدد شواہد موجود ہیں جن سے یہ واضح ہوتا اور پتا چلتا ہے کہ سماج میں اس کے مفید اور کارآمد اثرات بھی پڑے ہیں۔ شعرا کو فرماں رواؤں نے جس بے دریغ داد و دہش سے نوازا، یا کسی شعر پر انھیں سزا دی، یہ سب کچھ شعر کی تاثیر ہی کی دین تھا۔ میدانِ جنگ میں پڑھے جانے والے اشعار (رجز) بہادری و شجاعت کے جذبات کو ابھارنے میں کارگر ثابت ہوتے رہے ہیں۔ فرماں رواؤں کو نیک کام کرنے اور انصاف کرنے پر اُکسایا اور اس کا محدود ہی سہی، لیکن اثر پڑا۔ شعرا نے حسبِ حال اشعار سنا کر بادشاہوں کو جنگ و جدل اور قتل و غارت گری سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ شعرا نے اپنی شاعرانہ اور ادبی استعداد سے اپنے سفارتی کاموں میں سرخروئی حاصل کی۔ عرفا سے متعلق ایسے واقعات کثرت سے مرقوم ہیں کہ ان حضرات پر مجالسِ سماع میں کسی شعر پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور اسی عالمِ خودسپردگی میں یہ اپنے پروردگار سے جاملتے تھے۔ فارسی میں منظوم کلام کا یہ اثر اپنی نوعیت، کیفیت اور اثر انگیزی میں منفرد ہے۔ دیگر زبانوں کے منظوم کلام میں اس نوعیت کی تاثیر کا مشکل ہی سے پتا چلتا ہے۔ مزید برآں جہاں مراثی پڑھنے اور سننے والوں کو ہچکیوں سے رُلا دیتے ہیں، وہیں مزاحیہ اور طنزیہ کلام دلوں میں گدگدی پیدا کردیتا ہے۔ حسبِ حال شعر پڑھ یا سن کر آج بھی ہم جھوم جھوم اٹھتے ہیں، یعنی ایک شعر بعض اوقات ہماری اندرونی کیفیت و مسرت و غم کے طول طویل احساس کو دو مصرعوں میں سمو دیتا ہے۔ ایک شعر کے اتفاق سے حسبِ حال نکل آنے پر ہم واہ واہ کیے بغیر نہیں رہتے اور یہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ شعرا نے فطرتِ انسانی کے گونا گوں رنگوں اور پہلوؤں کو شعر میں ڈھالا ہے اور یہ خود ان کی بھی اندرونی کیفیات کی تصویر کشی اور ترسیم ہے۔ فارسی شعرا کے تذکروں میں درج ذیل چند واقعات شعر و شاعری کی تاثیر کی دلچسپ عکاسی کرتے ہیں۔

ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی (م 329ھ) کو فارسی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ یہ بخارا کے جواں سال بادشاہ نصر بن احمد امیر سامانی کے دربار سے وابستہ تھا اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ اثر و رسوخ میں بھی اس کا کوئی دوسرا ثانی نہیں تھا۔ اس کے اشعار کی تاثیر اور مقبولیت کا اندازہ فارسی کی معروف کتاب 'چہار مقالہ' کی اس روایت سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

نصر بن احمد ہرات میں خیمہ زن تھا۔ یہاں کی آب و ہوا اسے اس قدر پسند آئی کہ چار سال ہوگئے اور وہ اپنے پایۂ تخت بخارا لوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ہمراہی تنگ آگئے۔ وہ رودکی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ کچھ ایسا عمل کرے کہ بادشاہ اپنے وطن بخارا لوٹ جائے۔ اس خدمت کے لیے رودکی کو پانچ ہزار دینار پیش کیے گئے۔ رودکی نے موقع محل دیکھ کر ساز کے ساتھ اپنا ایک منظومہ پردۂ عشاق میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

بوی جوی مولیان آید ہمی — یاد یارِ مہربان آید ہمی
ریگِ آموی و دُرشتی ہای او — زیر پایم پرنیان آید ہمی

اور جب وہ اس بیت پر پہنچا:

میر ماہ است و بخارا آسمان — ماہ سویِ آسمان آید ہمی

امیر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ تخت سے کھڑا ہوگیا اور بغیر جوتے پہنے رکاب میں پیر رکھا اور بخارا کا رخ کیا۔[1] ایک شاعر ابوطالب نے اس سلسلے میں صحیح کہا ہے:

در سنگِ خارا نیز اثر می کند سخن
کوہ از صدا، ہمین سخن اظہار می کند[2]

دولت شاہ سمرقندی مشہور تذکرہ نگار ہے۔ یہ رودکی کے منظومے کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ایک سادہ سی نظم ہے، اس میں صنائع بدائع سے کام نہیں لیا گیا، اس میں ایسی متانت بھی نہیں، اگر آج سلاطین و امرا کی مجالس میں ایسی نظم پڑھی جائے تو کوئی اس پر دھیان نہیں دے گا، لیکن رودکی چوں کہ موسیقی کا بھی ماہر تھا، اس نے اس منظومے کو ایسے ڈھنگ اور انداز سے پیش کیا ہوگا کہ یہ نہایت زود اثر ثابت ہوا۔[3]

خواجہ علی شہاب ایک بار سلطان جوکی کے ہم رکاب قندھار پہنچے۔ شہزادے نے خواجہ علی کے قیام کے لیے اپنے قریب ہی انتظام کردیا۔ شہزادے کو مستقرِ سلطنت کی یاد نے بے چین کردیا۔ اس کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر آیا:

کنون کہ بادِ صبا مشکبار می گذرد
دریغ عمر کہ بی روی یار می گذرد

خواجہ علی تو قریب ہی قیام پذیر تھے۔ انھوں نے یہ شعر سنا اور دوڑتے ہوئے شہزادے کے پاس آئے اور کہا: اے شاہ عالم! یہ شعر اس طرح نہیں ہے، شہزادے نے پوچھا پھر کس طرح ہے؟ خواجہ علی نے پڑھا:

کنون کہ بادِ صبا مشکبار می گذرد
دریغ عمر کہ در قندھار می گذرد

شہزادے نے کہا واقعی یہی بات ہے اور جلد ہی ہرات کے لیے کوچ کیا۔[4]

محمد عوفی نے 'لباب الالباب' میں نقل کیا ہے کہ شاہ کبود جامہ کے خلاف حاسدوں نے ان کے مربی سلطان تکش کے کان بھردیے۔ سلطان نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا مصمم ارادہ کرلیا اور ایک گروہ کو حکم دیا کہ کبود جامہ کا سر کاٹ لائیں۔ شاہ کبود جامہ نے سلطان کے موکلوں کی بڑی خاطر تواضع کی اور انھیں انعام و اکرام سے بھی نوازا اور درخواست کی کہ انھیں سلطان کی خدمت میں زندہ لے چلیں اور پھر بھی اگر سلطان انھیں میرے قتل کا حکم دے تو قتل کردیں۔ اتفاق سے یہ گروہ اس دن سلطان کی خدمت میں پہنچا کہ سلطان نے ایک عظیم الشان جشن منعقد کیا ہوا تھا۔ سلطان کبود جامہ کو وہاں زندہ لانے پر پہلے موکلوں پر بہت ناراض ہوا اور چاہتا تھا کہ موکلوں کو سزا دے۔ شاہ کبود جامہ نے معذرت میں فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

من خاکِ تو در چشمِ خرد می آرم
عذرت نہ یکی، نہ دہ، کہ صد می آرم
سر چو خواستہ ای، بہ دستِ کس نتوان داد
می آیم، بر گردن خود می آرم

[میں تیرے در کی خاک کو اپنی آنکھوں میں لگاؤں گا۔ میں ایک بار نہیں سو بار معذرت پیش کرتا ہوں، آپ نے میرا سر لانے کو کہا تھا، میں اپنا سر کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا تھا، اس لیے خود آیا ہوں اور اپنا سر اپنی گردن پر اٹھا کر آپ کی خدمت میں لایا ہوں]

سلطان نے یہ رباعی سنی اور کبود جامہ کی پیشانی چومی اور اس کا جرم معاف کردیا، مزید برآں وہ جگہ جہاں یہ مجلس برپا تھی، اور جو کچھ وہاں موجود

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

تھا، سب اسباب اسے بخش دیا اور کبود جامہ کو اپنا مقرب بھی بنالیا۔[5]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے بارے میں یہ واقعہ معاصر اور بعد کے مآخذ میں تواتر سے مرقوم ہے کہ آپ علی سجزی کی خانقاہ میں جو آپ کی رہائش گاہ سے قریب ہی تھی، مجلسِ سماع میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔ قوال حضرت جام ژندہ پیل کی غزل گا رہا تھا۔ وہ جب اس شعر پر پہنچا:

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زمان از غیب جانی دیگر است

آپ پر وجد طاری ہوگیا۔ اسی عالمِ وجد میں آپ نے دو تین روز گزارے اور بالآخر جان جانِ آفرین کو تسلیم کردی۔[6] حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید اور ان کے ملفوظات 'فوائد الفواد' کے جامع حسن سجزی دہلوی نے اپنے ان اشعار میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:

جان بر این یک بیت دادہ است آن بزرگ
آری این گوہر زکانی دیگر است
کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانی دیگر است

ازرقی ہروی والیِ خراسان طغان شاہ سلجوقی کا مداح تھا۔ ایک بار یہ سلطان، احمد بدیہی سے نرد کھیل رہا تھا۔ کھیل کے آخر میں سلطان کے پاس تین مہرے اور دو ششگاہ تھے۔ احمد بدیہی کے پاس دو مہرے اور ایک گاہ (باری)، کعبتین (پانسہ) سلطان کے ہاتھ میں تھا۔ سلطان نے پانسہ پھینکا کہ چھے آئیں، لیکن تین آئے۔ سلطان بازی ہار گیا، بہت بے دماغ ہوا، غصّہ ہوا اس حد تک کہ اس کا ہاتھ ہر لحظہ شمشیر کے قبضے پر جاتا تھا، یعنی وہ اپنی ہار کی وجہ سے احمد بدیہی کو قتل کردینا چاہتا تھا۔ حاضرین کو دم مارنے کا یارانہ تھا۔ اس نازک موقعے پر ازرقی نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

گر شاہ سہ شش خواست، سہ یک نقش فتاد
تو ظن بری کہ کعبتین داد نداد
شش چون نگریست حشمت حضرت شاہ
از ہیبت شاہ روی بر خاک نہاد

[اگر شاہ چاہتا تھا کہ چھے آئیں لیکن آئے تین، تو یہ خیال نہ کرو کہ پانسے نے انصاف نہیں کیا، بات یہ ہے کہ پانسے نے جب شاہ کی جاہ و حشمت دیکھی تو اس کی ہیبت سے جس طرف پانسے پر چھے نقش تھے، وہ حصہ زمین پر رکھ دیا]

اس رباعی میں حسنِ تعلیل نے سلطان کا غصہ انبساط میں بدل دیا۔ اس نے ازرقی کو پانچ سو دینار بھی انعام میں عطا کیے۔[7]

متھرا داس ہندو شاہجہان کے دور میں بنگالہ میں بسر کرتے تھے۔ خان زمان کو اس صوبے کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ انھوں نے کسی وجہ سے متھرا داس کو قید کردیا۔ متھرا داس نے حکیم رکنا مسیح کاشی کو، جو اُس وقت بنگالہ میں تھے، اپنا شفیع بنایا۔ اس سلسلے میں انھیں ایک غزل بھیجی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

سلام ما کہ رساند حکیم رکنا را — ز درد من کہ خبر دہد مسیحا را
منم فتادہ بہ دام بلا بہ جرم سخن — سخن اسیر قفس کرد مرغ دانا را
شفاعت من کافر مگر مسیح کند — کہ بر مسیح تولّا بود نصاریٰ را

متھرا داس ہندو کے ان اشعار نے اپنا اثر دکھایا اور حکیم رکنا مسیح کی کوششوں سے آخر کار متھرا داس کو قید سے رہائی مل گئی۔[8] متھرا داس کے مندرجہ بالا اشعار سے پتا چلتا ہے کہ انھیں ان کے کسی شعر یا تصنیف پر قید کیا گیا تھا۔

یہ دلچسپ اور تاریخی واقعہ بھی اس سلسلے میں قابلِ توجہ ہے۔ نادر شاہ نے دہلی میں قتلِ عام کا حکم دے دیا تھا۔ وہ اس وقت چاندنی چوک میں دہلی کی کوتوالی کے قریب طرہ باز خاں کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سنہری مسجد کہلاتی ہے، بڑی تعداد میں لوگ قتل کردیے گئے۔ نادر کی سفاکی اور قہاری کے سامنے کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں تھی کہ دہلی کے عوام کی طرف سے معافی کا خواستگار ہو۔ نواب نظام الملک آصف جاہ نے اس موقعے پر ہمت سے کام لیا، وہ نادر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دست بستہ ادب سے خسرو کا یہ شعر پڑھا (یہ خسرو کا شعر ہے):

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر تو زندہ کنی خلق را و باز کشی

یہ شعر سن کر نادر کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے عام معافی کا حکم دے دیا۔[9]

ملاحظہ فرمایا کہ شعر و شاعری سننے اور پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ بے کار نہیں جاتی۔

حواشی:

1. چہار مقالہ: نظامی عروضی سمرقندی، مقدمہ و حل لغات و تشریحات از محمد جیلانی، تاج بک ڈپو، حویلی قدیم، حیدرآباد، ص 40-39۔
2. خزانۂ عامرہ: غلام علی آزاد بلگرامی، مطبع نولکشور، کانپور، ص 392۔
3. تذکرۃ الشعرا: دولت شاہ سمرقندی، تحقیق و تصحیح محمد عباسی، انتشارات کتاب فروشی بارانی، شاہ آباد، تہران، 1337ش، ص 38۔
4. ایضاً، ص 443۔
5. عرفات العاشقین و عرصات العارفین: تقی الدین محمد اوحدی، تصحیح ذبیح اللہ صاحبکاری و آمنہ فخر احمد، میراث مکتوب، تہران 389ش، ص 1946، شمع انجمن: نواب صدیق حسن خاں، تصحیح ڈاکٹر محمد کاظم کہدویی، انتشارات دانشگاہ یزد، ایران، 1384ش، 727۔
6. سیر الاولیا: امیر خورد کرمانی، اردو ترجمہ از اعجاز الحق قدوسی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، 1980، ص 142۔
7. خزانۂ عامرہ، ص 610، تذکرۃ الشعرا، ص 82۔
8. نشتر عشق: حسین قلی خاں عظیم آبادی، تصحیح اصغر جان فدا، نشریات دانش، دوشنبہ 1981، ص 1840۔
9. ایضاً، ص 517۔

D-23، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی-110013
Mob. No.: 98717 02648

ادبِ اطفال اور فاروق سیّد

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

اردو ادب میں ادبِ اطفال ایک ایسا میدان ہے جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن عملی سطح پر اسے وہ توجہ کم ہی نصیب ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ بچوں کے لیے لکھنا دراصل ایک پوری نسل کے ذہن، مزاج اور کردار کی تشکیل کا عمل ہے، اسی لیے اس میدان میں کام کرنے والے افراد محض ادیب نہیں ہوتے بلکہ ایک معنی میں وہ معمارِ قوم ہوتے ہیں۔ موجودہ عہد میں اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ ادبِ اطفال کے فروغ کا جائزہ لیں تو چند ایسے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اس میدان کو محض تحریر تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عملی تحریک میں بدلنے کی کوشش کی۔ فاروق سیّد انھی نمایاں شخصیات میں سے ایک تھے، جن کی زندگی اور خدمات کا مطالعہ ہمیں ادبِ اطفال کے امکانات اور اس کی سمت دونوں سے آگاہ کرتا ہے۔

فاروق سیّد میرے لیے صرف ایک نام نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت ہیں جن سے میرے کئی رشتے وابستہ ہیں۔ ایک وہ رشتہ جو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے تحت خود خالقِ کائنات نے قائم فرمایا ہے، اور دوسرا وہ رشتہ جو ادبِ اطفال کے دو مسافروں کے درمیان باہمی محبت، رفاقت اور ہم سفر ہونے کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جو رسمی تعارف سے آگے بڑھ کر دلوں کو جوڑ دیتا ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، یہ تو اب ٹھیک ٹھیک یاد نہیں، البتہ مختلف ادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رفتہ رفتہ یہ تعارف قربت میں اور قربت ایک بامعنی تعلق میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ غالباً 2014 کا زمانہ تھا، جب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی زمامِ کار پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں میں تھی۔ انھی دنوں مجھے فاروق سیّد صاحب کا فون موصول ہوا۔ انھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ بتایا کہ ادبِ اطفال کے تخلیق کاروں اور خصوصاً بچوں کے رسائل کے مدیران پر مشتمل ایک وفد پروفیسر ارتضیٰ کریم سے ملاقات کا ارادہ رکھتا ہے۔ میری آپ سے برادرانہ خواہش ہے کہ آپ بھی اس وفد میں شریک رہیں۔ آپ بھی طویل عرصہ سے ماہنامہ 'اچھا ساتھی' پابندی سے نکال رہے ہیں۔ یقیناً آپ بھی ان مسائل اور مشکلات سے دوچار ہوں گے جن سے ہم سب مدیران اردو رسائل دوچار ہیں۔ ان کی آواز میں جو دردمندی اور ادبِ اطفال کے لیے جو اضطراب تھا، وہ صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ میں نے بلاتردد اس دعوت کو قبول کرلیا اور اس پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ یہ وفد پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب سے ملا اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ ادبِ اطفال کے حال اور مستقبل پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس موقعے پر مدیران نے ایک اہم مسئلہ ان کے سامنے رکھا کہ قومی کونسل کی جانب سے بچوں کے لیے جاری کیا جانے والا رسالہ 'اردو دنیا' اپنی طباعت، معیار اور کم قیمت کے اعتبار سے یقیناً ایک قابلِ ستائش کاوش ہے، مگر اس کے بعض غیر ارادی اثرات بھی سامنے آرہے ہیں۔ ان سے یہ بھی گزارش کی گئی کہ قومی کونسل دیگر بچوں کے رسائل کی مالی اعانت کرے تاکہ وہ بھی اپنی اشاعت جاری رکھ سکیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب نے ان باتوں کو سنجیدگی سے سنا اور اس پر غور کرنے کا یقین دلایا۔ اسی نشست کے دوران فاروق سیّد صاحب سے تفصیلی گفتگو کا موقع ملا، اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ان کے اندر جو سچی تڑپ تھی، وہ پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آئی۔

بعد ازاں فاروق سیّد صاحب کی ہی پہل پر بچوں کے رسائل کے مدیران کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی عملی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں ایک نشست منعقد ہوئی جس میں خیال انصاری صاحب، عبداللہ غازی صاحب، عنایت اللہ فلاحی صاحب، نوشاد مومن صاحب، ریحان کوثر صاحب، سلیم رحمانی صاحب، عبدالباری وسیم صاحب شریک تھے۔ اسی نشست میں ایک انجمن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جس کا نام 'چلڈرن اردو میگزین ایسوسی ایشن' (CUMA) رکھا گیا۔ جب اس کے عہدے داران کا انتخاب عمل میں آیا تو میرے لیے یہ باعثِ حیرت بھی تھا اور اعزاز بھی کہ مجھے اصرار کے ساتھ اس کا صدر منتخب کیا گیا، حالاں کہ میں

نے اس سے معذرت کی کوشش کی تھی۔ فاروق سیّد صاحب اس کے سکریٹری منتخب ہوئے اور انھوں نے نہایت ذمے داری کے ساتھ اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔ آن لائن نشستوں کا باقاعدہ انعقاد، مدیران کے درمیان ربط پیدا کرنا اور مسائل کو منظّم انداز میں پیش کرنا؛ یہ سب ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا واضح ثبوت ہے۔ ان کے ساتھ میرے تعلق کا ایک اور پہلو بھی نہایت خوشگوار یادوں سے وابستہ ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ممبئی جانے کا ارادہ کیا تاکہ اپنی بہن سے ملاقات کرسکوں۔ میں نے اس کی اطلاع فاروق سیّد صاحب کو دی تو انھوں نے بڑی محبت سے کہا کہ پہلے آپ میرے مہمان ہوں گے، اس کے بعد کہیں اور جائیں گے۔ چناں چہ میں نے ان کی اس محبت کو قبول کیا۔ وہ خود مجھے ریلوے اسٹیشن لینے آئے، اور میرے قیام کا انتظام حج ہاؤس میں کیا، جہاں عام طور پر اہم ملی اور علمی شخصیات قیام کرتی ہیں۔ یہیں پر بچوں کے معروف ادیب اشفاق عمر صاحب مجھ سے ملاقات کے لیے آئے۔ جو ایک یادگار لمحہ تھا۔ مزید یہ کہ فاروق سیّد صاحب نے میرے اعزاز میں ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا، جس میں ممبئی کے معزز تاجر، معروف ادبا، شعرا اور علمی و ملی شخصیات شریک ہوئیں۔ اس موقعے پر انھوں نے میرا تفصیلی تعارف پیش کیا اور مجھے اظہارِ خیال کا موقع دیا۔ اس نشست کی یاد آج بھی ذہن میں تازہ ہے، اور اس کے ذریعے ان کی محبت، خلوص اور مہمان نوازی کا جو پہلو سامنے آیا، وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فاروق سیّد کا تعلق مہاراشٹر کے شہر سولاپور سے تھا، جہاں انھوں نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ انھوں نے بچپن ہی میں ذمے داری کا بوجھ محسوس کرلیا تھا۔ یہ محض ایک روایتی جملہ نہیں بلکہ اس کے عملی شواہد موجود ہیں کہ وہ چوتھی جماعت ہی سے مختلف چھوٹے موٹے کاموں کے ذریعے اپنے گھر کے اخراجات کی تکمیل میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ سوڈا فیکٹری میں کام کرنا، وڑا پاؤ بیچنا، پتنگیں تیار کرنا یا اگربتیاں فروخت کرنا، یہ سب وہ تجربات ہیں جن کا ذکر خود ان کے قریبی احباب اور معاصرین نے کیا ہے، اور یہی تجربات بعد میں ان کی شخصیت کی مضبوطی اور خودداری کا سبب بنے۔

سولاپور جیسے شہر میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان کے لیے بہتر معاشی مواقع محدود تھے، اس لیے انھوں نے حالات کا ادراک کرتے ہوئے ممبئی کا رخ کیا۔ یہ فیصلہ دراصل ان کی دوراندیشی اور عملی سوچ کی دلیل ہے، کیوں کہ ممبئی آج کی طرح اس زمانے میں بھی معاشی اور ادبی دونوں حوالوں سے امکانات کا شہر سمجھا جاتا تھا۔

ممبئی پہنچ کر فاروق سیّد نے جس انداز میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، وہ ان کی غیر معمولی خودداری کا مظہر ہے۔ یہ بات اب متعدد بیانات اور یادداشتوں میں محفوظ ہے کہ انھوں نے ابتدائی دنوں میں گلی کوچوں میں ٹوٹے ہوئے انڈے بیچ کر اپنی ضروریات پوری کیں۔ وہ خود اس تجربے کو بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ وہ صبح کے اوقات میں محنت مزدوری کرتے اور پھر تعلیم کے لیے کالج جاتے۔ اس مرحلے کو محض معاشی جدوجہد نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو ظاہر کرتا ہے جس میں محنت سے گریز نہیں بلکہ اسے زندگی کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔

ممبئی میں ان کے بعض قریبی رشتہ داروں، خصوصاً ان کی خالہ، نے انہیں سہارا دیا، جس سے انہیں ابتدائی استحکام ملا۔ بعدازاں علمی و ادبی حلقوں سے ان کی وابستگی نے ان کے اندر موجود صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

فاروق سیّد کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز مکتبہ جامعہ بمبئی سے وابستگی کے ساتھ ہوا، جہاں انھیں کتابوں اور اہلِ قلم کے درمیان رہنے کا موقع ملا۔ یہ وہ ماحول تھا جس نے ان کے اندر ادب کے لیے سنجیدہ دلچسپی پیدا کی۔ اس کے بعد روزنامہ 'اردو ٹائمز' بمبئی سے ان کی وابستگی ایک اہم مرحلہ ثابت ہوئی۔ یہاں انھوں نے بطور پروف ریڈر کام شروع کیا، جس سے ان کی صلاحیتوں کو جلا ملی اور ان کا ادبی ذوق پروان چڑھا پھر ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کا اندازہ کرکے معروف صحافی ساجد رشید اور انجم رومانی جیسے اہلِ قلم کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی، چنانچہ یہی وہ موقع تھا جب انھیں مذکورہ اخبار میں بچوں کے صفحے کی ذمے داری دی گئی۔ اس ذمے داری نے دراصل ان کی زندگی کا رخ متعین کردیا، کیوں کہ اسی صفحے کی ادارت کے دوران 'گل بوٹے' کا تصور وجود میں آیا، جو بعد میں ایک مستقل رسالے کی شکل اختیار کرگیا۔

1996 میں ماہنامہ 'گل بوٹے' کا اجرا اردو ادبِ اطفال کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ابتدا میں یہ محدود وسائل کے ساتھ شروع ہونے والا رسالہ تھا، مگر اس کے پیچھے جو وژن کارفرما تھا وہ نہایت واضح اور بامقصد تھا۔ فاروق سیّد نے اس رسالے کو محض بچوں کی تفریح کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے اخلاقی تربیت، ذہنی نشوونما اور تعلیمی رہنمائی کا ایک مؤثر وسیلہ بنایا۔

چار رنگوں میں شائع ہونے والا یہ رسالہ اپنی طباعت اور پیشکش کے اعتبار سے بھی ممتاز تھا۔ اس میں شامل تحریریں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کی جاتی تھیں، جس میں کہانی، نظم، معلوماتی مضامین اور ذہنی مشقوں کا ایسا امتزاج ہوتا تھا جو بچوں کو بیک وقت متوجہ بھی کرتا اور سکھاتا بھی تھا۔ یہ خصوصیت اسے دوسرے رسائل سے ممتاز کرتی ہے۔

اشاعتی اعتبار سے 'گل بوٹے' کی ترقی ایک قابلِ ذکر مثال ہے۔ خود فاروق سیّد کے بیان کے مطابق، اس کی اشاعت 250 کی تعداد سے شروع ہوئی اور وقت کے ساتھ بڑھ کر 25 ہزار تک پہنچی۔ اہم بات یہ ہے کہ مہاراشٹر کے متعدد اردو اسکولوں میں یہ رسالہ باقاعدگی سے پہنچایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خلیجی ممالک جیسے دبئی، شارجہ، سعودی عرب اور قطر تک اس کی رسائی اس کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔

فاروق سیّد کی خدمات صرف ایک رسالے کی ادارت تک محدود نہیں رہیں۔ انھوں نے عملی سطح پر ایسے اقدامات کیے جن سے ادب اور تعلیم کے درمیان میں ایک مضبوط رشتہ قائم ہوا۔ 'گل بوٹے اسکالرشپ امتحان' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، جس میں ہزاروں طلبہ کی شرکت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محض ایک رسمی سرگرمی نہیں بلکہ ایک موثر تعلیمی اقدام تھا۔ اس امتحان کے ذریعے طلبہ کو نہ صرف اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو پرکھنے کا موقع ملا بلکہ اردو میڈیم طلبہ میں ایک صحت مند مقابلے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ اسی طرح انھوں نے مختلف اسکولوں کے لیے امتحانی پرچوں کی تیاری کا نظام بھی قائم کیا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ادب کو محض تخلیقی سرگرمی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے تعلیمی نظام سے جوڑنے کے قائل تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے اردو ادب کے مسائل پر دہلی میں بھی کئی پروگرام کیے۔ فاروق سیّد کا ایک اور نمایاں کارنامہ 'اردو میلہ' کا انعقاد ہے، جس کا پہلا پروگرام سولاپور میں منعقد ہوا۔ اس میلے کی صدارت معروف شاعر علی سردار جعفری اور افتتاح کالی داس گپتا رضا نے کیا، جو اس کی اہمیت کا واضح ثبوت ہے۔ بعدازاں یہ میلہ ایک مستقل روایت بن گیا اور مختلف شہروں میں منعقد ہوتا رہا، جس میں طلبہ، اساتذہ اور ادیب بڑی تعداد میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ یہ میلہ دراصل ایک ایسی کوشش تھی جس کے ذریعے اردو زبان کو محض نصابی دائرے سے نکال کر ایک زندہ تجربہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ 'اردو جلوس' اور ہفت روزہ اخبار جیسے اقدامات بھی ان کی اسی فکر کا تسلسل ہیں۔

فاروق سیّد کا تصورِ ادبِ اطفال نہایت واضح اور بامقصد تھا۔ وہ ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے کردار سازی اور فکری تربیت کا ایک اہم وسیلہ قرار دیتے تھے۔ ان کے بیانات میں یہ بات بار بار سامنے آتی ہے کہ زبان کسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ ایک زینہ ہوتی ہے، اور اصل اہمیت تعلیم کی ہے۔ ان کا یہ قول کہ "ہمیں جڑوں میں کھاد ڈالنے کی ضرورت ہے، پتّوں پر پانی چھڑکنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا" دراصل ان کی فکری بصیرت کا نچوڑ ہے۔

حال ہی میں 'جشنِ بچپن' کے ذریعے انھوں نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا جو انوکھی نوعیت کا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ سلسلہ مزید شہروں تک پہنچتا حتیٰ کہ اس کا انعقاد بیرونِ ملک کیا جاتا اور اس کی مقبولیت کا دائرہ وسیع تر ہوتا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا اخلاق اور طرزِ عمل تھا۔ ان سے ملنے والے اکثر افراد اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ وہ نہایت منکسر المزاج، شفیق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور انھیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ ان کی یہی خوبی انھیں محض ایک مدیر نہیں بلکہ ایک مربی اور رہنما کے طور پر نمایاں کرتی ہے۔

فاروق سیّد صاحب کا عظیم علمی و ادبی سرمایہ گل بوٹے کی فائلوں کی صورت میں موجود ہے۔ گل بوٹے کے اداریوں پر مشتمل ان کے دو مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چند اہم اور معروف تصانیف درج ذیل ہیں:

ہم بھی ہو آئے کراچی (سفرنامہ- 2017)
چھوٹی سی بات (مجموعہ-2019)
ذوق نظر (ادبی مضامین-1999)

فاروق سیّد کی وفات (19 مئی 2026) کی خبر نے اردو دنیا، خصوصاً ادبِ اطفال کے حلقے میں گہرے رنج و الم کی کیفیت پیدا کردی۔ مختلف ادبی حلقوں، سوشل میڈیا اور ذاتی بیانات میں جس انداز سے ان کے لیے تعزیتی کلمات سامنے آئے، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ہردل عزیز شخصیت تھے۔ ان کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ بظاہر فوری طور پر پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

فاروق سیّد کی زندگی کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ادبِ اطفال جیسے بظاہر نظرانداز کیے جانے والے میدان میں بھی اگر خلوص، محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کیا جائے تو غیر معمولی نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ ایک فرد بھی ایک تحریک کا آغاز کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے اندر عزم اور اخلاص موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کی خدمات کو صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔ ساحر شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے:

ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھُول کھِل کے رہیں گے، جو کھلنے والے ہیں

ایڈیٹر ماہنامہ 'اچھا ساتھی'، سرکڑہ، بجنور
Mob. No. 9897334419
E-mail: nadwisirajuddin@gmail.com

سیر المنازل
(مرزا سنگین بیگ)
شریف حسین قاسمی
قیمت: 600روپے

اردو دُنیا

اردو اور مراٹھی زبانوں کے فروغ کے لیے

ہر ممکن تعاون جاری رہے گا: مادھوی کھوڑے

ممبئی (24 جون)۔ مہاراشٹر حکومت کے محکمۂ اقلیتی امور کی سکریٹری مادھوی کھوڑے چاورے سے گذشتہ دنوں ممبئی میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی ممبئی کے کارگزار چیئرمین سیّد حسین اختر نے خصوصی ملاقات کی۔ اس موقعے پر اردو زبان وادب کے فروغ، اکادمی کی سرگرمیوں اور مستقبل کے منصوبوں کے حوالے سے خوشگوار ماحول میں تفصیلی تبادلۂ خیال ہوا۔ ملاقات کے دوران سیّد حسین اختر نے مادھوی کھوڑے چاورے کا پُرتپاک استقبال کرتے ہوئے ان کی اردو زبان وادب سے وابستگی اور خدمات کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ مادھوی کھوڑے چاورے ایک فعال، متحرک اور اردو سے محبت رکھنے والی شخصیت ہیں، جنھوں نے اپنی ذمے داریوں کو بخوبی انجام دیتے ہوئے اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے متعدد مثبت اقدام کیے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کے مختلف شعبوں اور اردو اکیڈمی کے درمیان ہم آہنگی سے اردو زبان وادب کے فروغ کی رفتار مزید تیز ہوسکتی ہے اور نئی نسل کو اردو کے علمی وادبی سرمایے سے جوڑنے میں مدد ملے گی۔ اس موقعے پر سکریٹری مادھوی کھوڑے نے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کی موجودہ سرگرمیوں اور پروگراموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ ادوار کے مقابلے میں اردو اکیڈمی کی سرگرمیوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اکیڈمی کی جانب سے منعقد کیے جانے والے ادبی اجلاس، ثقافتی پروگرام اور اردو کے فروغ سے متعلق اقدام قابلِ تحسین ہیں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اردو اور مراٹھی دونوں زبانوں کے فروغ اور ترقی کے لیے اپنی جانب سے ہر ممکن تعاون جاری رکھیں گی۔ ملاقات کے دوران اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ اردو اور مراٹھی زبانوں کے درمیان موجود مضبوط تہذیبی اور ادبی رشتوں کو مزید مستحکم کیا جائے اور دونوں زبانوں کے فروغ کے لیے مشترکہ پروگراموں کو فروغ دیا جائے۔ یہ ملاقات اردو زبان کے روشن مستقبل اور سرکاری سطح پر زبان کے فروغ کے لیے ایک مثبت پیش رفت قرار دی جارہی ہے۔

(روزنامہ 'آج کی آواز'۔ اورنگ آباد دکن)

چھٹا امام شاہ ولی اللہ ایوارڈ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے نام

نئی دہلی (29 جون)۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے مشترکہ زیرِ اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار ہال میں ایک علمی وفکری مذاکرہ منعقد کیا گیا، جس میں مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ جلد دہم پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ مجموعہ ہائے رسائل شاہ ولی اللہ کا باضابطہ اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اپنا چھٹا امام شاہ ولی اللہ ایوارڈ معروف دانشور اور سابق چیئرمین دہلی اقلیتی کمیشن ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کو پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت وشرکت کرنے والی ممتاز شخصیات میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جسٹس اقبال احمد انصاری، سراج حسین اور محمد ادیب شامل تھے، جب کہ معروف صحافی و ادیب معصوم مرادآبادی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز مفتی ظفیر الدین صاحب کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا، بعدازاں نظامت کے دوران معصوم مرادآبادی نے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے تعارف کے لیے سہیل انجم کو دعوت دی۔ اپنے خطاب میں سہیل انجم نے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کا قیام اور اس کی علمی خدمات دراصل اس کے بانی مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کی مسلسل محنت، عزم اور علمی بصیرت کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا قاسمی نے محدود وسائل کے باوجود ایک ایسا تحقیقی ادارہ قائم کیا ہے جو شاہ ولی اللہ دہلوی کے نادر ونایاب علمی ذخیرے کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کررہا ہے۔ مقررین نے ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کی علمی خدمات، قرآنی فہم اور بالخصوص ان کے انگریزی ترجمۂ قرآن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سال انھیں اس اعزاز کے لیے منتخب کرنا انسٹی ٹیوٹ کی علمی بصیرت اور شخصیت شناسی کی روشن مثال ہے۔ تقریب کے اختتام پر شرکا نے امید ظاہر کی کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ آئندہ بھی علمی وتحقیقی روایت کو اسی طرح فروغ دیتا رہے گا۔ (ہمارا سماج۔ دہلی)

کشن گنج میں 100 اُردو اسکولوں کے قیام کا فیصلہ خوش آئند

وزیرِ اعلا سمراٹ چودھری کو مبارک باد، فاطمہ گروپ آف ایجوکیشن کے چیئرمین ڈاکٹر اسد اللہ خاں کا اظہارِ تشکر

پٹنہ/ کشن گنج (4 جولائی)۔ وزیرِ اعلا سمراٹ چودھری کا کشن گنج میں 100 اُردو ڈگری اسکولوں کے قیام کا فیصلہ تاریخی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں فاطمہ گروپ آف انسٹی ٹیوشنز کے چیئرمین اسد اللہ خاں نے کہا کہ اگر موثر طریقے سے اسے نافذ کیا جائے تو یہ اسکیم ایک تاریخی اقدام ثابت ہوگی جو نہ صرف کشن گنج بلکہ پورے سیمانچل خطے کے تعلیمی اور سماجی منظرنامے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی کی مضبوط بنیاد ہے۔ جہاں تعلیم پھیلتی ہے وہاں سماجی بیداری، معاشی ترقی اور قومی اتحاد فطری طور پر مضبوط ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسد اللہ خاں نے کہا کہ سیمانچل خطہ طویل عرصے سے تعلیمی شعبے میں خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ یہاں بہت سے ہونہار طلبہ ہیں جو معیاری تعلیمی اداروں اور مناسب مواقع کی کمی کی وجہ سے اپنی حقیقی صلاحیتوں کے مطابق ترقی نہیں کرپارہے ہیں۔ اگر حکومت نئے اردو ڈگری اسکول قائم کرے اور انھیں جدید سہولتوں سے آراستہ کرے تو یہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کو ایک نئی سمت فراہم کرے گا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے، محض ایک زبان نہیں ہے بلکہ ریاست کے مشترکہ ثقافتی ورثے کا ایک اہم حصہ ہے، لہٰذا اردو میڈیم سے اعلا تعلیم کو مضبوط بنانا مساوی مواقع، لسانی احترام اور سماجی شمولیت کو یقینی بنانے کی جانب ایک اہم قدم ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان اداروں میں جدید تعلیم، سائنس، ریاضی، کمپیوٹر اسٹڈیز، انفارمیشن ٹیکنالوجی، انگلش، اسکل ڈیولپمنٹ اور روزگار پر مبنی کورسز کو شامل کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر غلام غوث نے اس اعلان کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس کے لیے انھی جگہوں کا تعین کیا جائے جہاں کثیر تعداد میں اردو آبادی بستی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ اعلان صرف اعلان نہ ہو بلکہ اسے حتمی شکل دینے کے لیے عملی اقدام کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

(سوشل موومنٹ۔ پٹنہ)

انجمن ترقی اردو، ادارہ ادبیاتِ اردو اور اردو مجلس سے اردو کو تقویت حاصل تھی

مذکورہ اداروں کی سرگرمیاں بحال کرنے کے تعلق سے خطاب

حیدرآباد (30 مئی)۔ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کا بحوالہ یادِ رفتگان ماہانہ ادبی اجلاس ومشاعرہ میڈیا پلس گن فاؤنڈری میں منعقد ہوا۔ ادبی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جوائنٹ اڈیٹر روزنامہ 'اعتماد' جناب عزیز احمد نے کہا کہ اردو زبان کے تحفظ کے لیے معاشرے میں شعور بیداری پروگرام وقت کا اہم تقاضا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کے ساتھ جب جب بھی ناانصافیاں ہوئی ہیں اُس وقت اردو والوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حافظ ابو یوسف، ایم باگا ریڈی، ٹی انجیا کے علاوہ بے شمار سیاسی قائدین اور مجاہدینِ اردو نے اردو کے کاز کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا تھا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی نہج پر آج ہم اردو زبان کے تحفظ کے لیے ایک لائحۂ عمل طے کریں اور جہاں جہاں اردو زبان سے متعلق ناانصافیاں دیکھنے میں آئیں اربابِ مجاز کو توجہ دلائیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان اپنے ہی ملک میں اجنبی ہوتی جارہی ہے جب کہ امریکہ، لندن اور دیگر ممالک میں اردو کا چلن کافی حوصلہ افزا ہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو میں بھی نئی جان ڈالنے پر زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ حیدرآباد دکن کی عالمی شہرت یافتہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی تعلیم کا خاص نظم تھا، اب اردو زبان اور عربی زبان یہاں پر آخری سانسیں لے رہی ہیں۔ ڈاکٹر ناظم علی نے کہا کہ محض اردو زبان کی عظمتِ رفتہ کی بقا کے لیے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام عمل میں لایا تھا اسی طرح دائرۃ المعارف عثمانیہ یونیورسٹی اور اردو ہال حمایت نگر بھی اردو والوں کی شان ہیں۔ ان اداروں کی خدمات سے استفادہ کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ سینئر شاعر وصدر ادارہ میرا شہر میرے لوگ جناب صلاح الدین نیّر نے کہا کہ انجمن ترقی اردو کے ہر ماہ جلسے اور اضلاع میں کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں، اب انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں نہیں کے برابر ہیں، اردو مجلس بھی کافی سرگرم تھی جس سے اردو زبان کو بڑی تقویت حاصل ہوا کرتی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پرانی روایات کا احیا ہونا چاہیے اور اردو زبان کی ترقی کے لیے ہم سب کو سرگرمِ عمل ہونا ضروری ہے۔

ڈاکٹر فاضل حسین پرویز (چیف اڈیٹر ہفت روزہ 'گواہ') نے کہا کہ ڈاکٹر زورؔ کا قائم کردہ ادارۂ ادبیاتِ اردو ہو یا انجمن ترقی اردو، یہ قوم کے اثاثے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نامساعد حالات اور اردو والوں کی بے رخی کے باوجود ادارۂ ادبیاتِ اردو بڑی حد تک کام کررہا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کا حال بہت بُرا ہے، اردو سیکشن میں برائے نام ہی افراد کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔ اردو والوں کو بالخصوص اساتذہ کو چاہیے کہ وہ کتب خانہ آصفیہ کی نادر ونایاب کتابوں سے اپنی علمی معلومات میں اضافہ کریں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جہانگیر احساس نے کہا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اردو زبان وادب سے متعلق اردو والوں کو جو احساس عطا کیا تھا وہ احساس دن بہ دن ختم ہوتا جارہا ہے، نئی نسل میں دکن کے حوالے سے شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ ادبی اجلاس کی نظامت ممتاز ومعروف شاعر جناب لطیف الدین لطیف نے کی اور عوام سے خواہش کی کہ وہ اپنے بچوں کو لازمی طور پر اردو زبان سکھائیں۔ جناب لطیف الدین لطیف کے شکریے پر ادبی اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ابن سینا اکیڈمی اور حرف زار لٹریری سوسائٹی کے اشتراک سے

ایک پُروقــار ادبی شـــام

علی گڑھ (2 جولائی)۔ ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ اور حرف زار لٹریری سوسائٹی علی گڑھ کے زیرِ اہتمام ابن سینا اکیڈمی کے ہال میں ایک پُروقار محفلِ مشاعرہ اور اعزازی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ یہ محفل حیدرآباد سے تشریف لائے ممتاز شاعر و ادیب پروفیسر مسعود احمد اور اترا کھنڈ اردو اکیڈمی کے سابق وائس چیئرمین و ممتاز شاعر افضل منگلوری صاحب کی علی گڑھ آمد کے سلسلے میں سجائی گئی تھی۔ تقریب کی صدارت ملک کے مایۂ ناز اسکالر پدم شری پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن صاحب نے فرمائی، جب کہ نظامت کے فرائض حرف زار لٹریری سوسائٹی کے سکریٹری اور ممتاز شاعر ڈاکٹر مجیب شہزر نے اپنے مخصوص انداز میں انجام دیے۔ دیگر معزز مہمانان میں پٹنہ سے تشریف لائے بہترین لب و لہجے کے شاعر عالم خورشید صاحب اور ممتاز گلوکار و شاعر جانی فاسٹر صاحب شامل تھے۔

اس یادگار موقعے پر پروفیسر مسعود احمد صاحب کو علی گڑھ کے ممتاز اور معتبر شاعر رئیس الدین رئیس کے نام سے منسوب باوقار ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی اردو ادب کے لیے گراں قدر خدمات کے اعتراف میں افضل منگلوری صاحب کی خدمت میں بھی خصوصی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ محفل کے صدر، پدم شری پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں علی گڑھ شہر کی زمین کو علم و ادب کا گہوارہ قرار دیتے ہوئے ایک انتہائی فکر انگیز اور تفصیلی گفتگو فرمائی۔ انھوں نے علی گڑھ شہر کی تاریخی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہاں کی نابغۂ روزگار ہستیوں کا ذکر چھیڑا تو گویا پوری محفل کو منور کر دیا۔ انھوں نے موجودہ دور میں کتابوں اور کتب خانوں کی گرتی ہوئی روایت پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بہتری کے لیے اقدام کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کتابیں انسانی شعور کو جلا بخشتی ہیں اور تہذیبوں کی امین ہوتی ہیں۔ کوئی بھی معاشرہ علم اور کتب سے کٹ کر مادی ترقی تو کر سکتا ہے، لیکن ذہنی اور اخلاقی طور پر بالیدہ نہیں ہو سکتا۔

اعزازی تقریب اور صدارتی خطبے کے بعد مشاعرے کا دور شروع ہوا جس میں ملک کے مختلف گوشوں سے آئے مہمان شعرا کے علاوہ علی گڑھ کے چیدہ چیدہ اور نمائندہ شعرائے کرام نے اپنا تازہ کلام پیش کر کے سامعین سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں

سہ ماہی ’ادب سلسلہ‘ کے سفرنامہ نمبر کی پُروقار رونمائی

نئی دہلی (یکم جولائی)۔ ممتاز ادبی و تحقیقی سہ ماہی ’ادب سلسلہ‘ کے مدیر سلیم علیگ کی دہلی آمد کے موقعے پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ان کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر ادبی حلقوں میں خاص جوش و خروش دیکھنے میں آیا اور اہلِ علم و ادب نے ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس موقعے پر ’ادب سلسلہ‘ کے تازہ خصوصی شمارے ’سفرنامہ نمبر‘ کی باوقار رونمائی شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر کوثر مظہری نے کی۔ اس خصوصی شمارے کو ادبی دنیا میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو رہی ہے اور علمی حلقوں میں اسے بے حد سراہا جا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو سفرنامے کی روایت، ارتقا، فکری جہات اور فنی خصوصیات کو اس جامع انداز میں پیش کرنے والا دستاویزی نوعیت کا یہ ایک خصوصی شمارہ ہے۔ تقریبِ رونمائی کے دوران شرکا نے اس خصوصی اشاعت کی تحقیقی و ادبی افادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسے معیاری اور موضوعاتی شمارے اردو ادب کی تنقیدی و تحقیقی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مقررین نے اس امر پر بھی زور دیا کہ ادبی رسائل کسی بھی زبان کی فکری زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں اور ’ادب سلسلہ‘ نے اپنے سنجیدہ اور معیاری انتخاب کے ذریعے اردو صحافت و ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ اس موقعے پر صدرِ شعبہ پروفیسر کوثر مظہری، مدیر اعلا سلیم علیگ، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر نوشاد منظر، ادب سلسلہ کے نائب مدیر ڈاکٹر خان محمد رضوان، ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی سمیت متعدد اساتذۂ کرام اور اہلِ علم موجود تھے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

پروفیسر جاوید پاشا کو لائف ٹائم اچیومنٹ اعزاز

بیڑ (19 جون)۔ ضلع بیڑ کی معروف علمی، ادبی اور صحافتی شخصیت پروفیسر جاوید پاشا کی 36 سالہ مثالی تعلیمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں 20 جون 2026 کو ایک شاندار تقریب ’لائف ٹائم اچیومنٹ اعزاز‘ منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات، اساتذہ، ادبا، شعرا، صحافی اور سماجی کارکنان نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ یہ اطلاع آرگنائزر بزمِ شمع ادب کے صدر محمد قمر الایمان خاں کی جانب سے دی گئی ہے۔ پروفیسر جاوید پاشا نے ملیہ جونیر کالج میں مسلسل 36 برس تک تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے ہزاروں طلبہ کی علمی، اخلاقی اور فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس موقعے پر مقررین نے پروفیسر جاوید پاشا کی زندگی، خدمات اور کامیابیوں پر روشنی ڈالی۔ تقریب کے اختتام پر انھیں ’لائف ٹائم اچیومنٹ اعزاز‘، توصیفی سند اور یادگاری شال پیش کر کے تہنیت پیش کی گئی۔ علم دوست حضرات نے اس پروگرام میں کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ان کی خدمات کو آرگنائزر بزمِ شمع ادب کے صدر و روزنامہ ’الہلال ٹائمز اردو‘ کے مدیر محمد قمر الایمان خاں نے بھی سراہا ہے۔

(اورنگ آباد ٹائمز)

ڈاکٹر وصی الحق وصی کی دو کتابوں پر مذاکرہ

نئی دہلی (5 جولائی)۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں عبارت پبلی کیشن، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام قطر میں مقیم اُردو کے معروف شاعر اور فکشن نگار ڈاکٹر وصی الحق وصی کی دو کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مقررین نے ’خواب منزل‘ (دیوانِ وصی) اور کورونا کہانیوں پر مشتمل مجموعے ’ٹوٹتی سانسوں کے درمیان‘ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر وصی الحق وصی کے تخلیقی اظہار کی انفرادیت اور امتیازات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ صدرِ تقریب پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ان کے یہاں الفاظ کی مصنوعی آرائش یا پیچیدہ استعارات سے زیادہ دل کی کیفیت اور جذبے کی صداقت نمایاں ہوتی ہے۔ انھوں نے وصی کے شعری موضوعات، جدید انسان کی داخلی کشمکش، ہجرت، تنہائی، وقت کی بے ثباتی اور روحانی جستجو کے حوالے سے بھی کچھ اہم نکات پیش کیے۔ پروفیسر خالد محمود نے وصی کے دیوان ’خواب منزل‘ کو موضوعاتی تنوع اور فنی گیرائی و گہرائی کے اعتبار سے ایک منفرد تخلیقی اظہاریہ قرار دیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے دیوانِ وصی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وصی الحق وصی نے اردو میں دیوان کی ختم ہوتی ہوئی روایت کا احیا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جناب خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ نے وصی کی شاعری اور فکشن دونوں پر مربوط اور معروضی گفتگو کی۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مہجری شاعری کے رجحانات اور فکری تشخصات کی روشنی میں ڈاکٹر وصی الحق وصی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ موضوعی اعتبار سے ہجرت کا کرب ان کی شاعری کا کلیدی عنصر ہے۔ معروف صحافی اور کالم نگار جناب سہیل انجم نے وصی الحق وصی کے دیوان ’خواب منزل‘ کے حوالے سے ان کی شعری لفظیات اور متنوع موضوعات پر روشنی ڈالی۔ حقانی القاسمی نے ان کے دیوان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ وصی نے خواب کو ایک تلازماتی استعارے کے طور پر اپنی شاعری میں برتا ہے اور لاشعور کی علامتی زبان کو ایک نئی صوت و صورت عطا کی ہے۔ انھوں نے سخن دریا کی اس نئی لہر کو اردو کی معاصر شاعری کے لیے ایک جمود شکن نقطہ قرار دیا۔ اس موقعے پر کورونا کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ’ٹوٹتی سانسوں کے درمیان‘ پر جناب عشرت ظہیر اور ڈاکٹر ذاکر فیضی نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔

تقریب کی نظامت کے فرائض معروف ادیب و شاعر اور ناظم معین شاداب نے بہ حسن و خوبی انجام دیے۔ مذاکرے کے بعد مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شہپر رسول نے فرمائی۔ اس مشاعرے میں پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر سہیل فاروقی، معین شاداب، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر افروز طالب، وسیم خان و وسیم مجاز، ایم صدیقی، پروین شغف اور اسرار رازی نے اپنے کلام بلاغت نظام سے محظوظ کیا۔ اس موقعے پر صاحبِ اعزاز ڈاکٹر وصی الحق وصی نے بھی بطورِ خاص اپنا کلام پیش کیا اور آخر میں عبارت پبلی کیشن کے سربراہ سلام الدین خاں نے شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

محمد ابوزید کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض

موتیہاری (پریس ریلیز)۔ ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا کے ریسرچ اسکالر محمد ابوزید شیخ سالم کو 20 مئی 2026 کو یونیورسٹی کی جانب سے تمام تعلیمی تقاضوں کی تکمیل اور وائیوا میں نمایاں کامیابی کے بعد ڈاکٹریٹ (پی ایچ. ڈی) کی ڈگری تفویض کی گئی۔ قابلِ ذکر ہے کہ موصوف نے پی ایچ. ڈی میں داخلے سے قبل یو جی سی نیٹ اور جے آر ایف دونوں امتحانات کامیابی کے ساتھ کوالیفائی کیے تھے۔ نیٹ میں کامیابی کے بعد انھوں نے ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا میں پی ایچ. ڈی میں داخلہ لیا اور کورس ورک مکمل کیا۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ’مولانا ولی رحمانی کی ادبی اور علمی خدمات کا اجمالی جائزہ‘ ہے۔ اس موقعے پر محمد ابوزید نے اپنے گائیڈ ویر کنور سنگھ اور پروفیسر سیّد شاہ حسین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مخلصانہ رہنمائی کے سبب میرا یہ سفر آسان ہو گیا۔ محمد ابوزید کو ان کے اساتذہ اور ساتھیوں نے مبارک باد پیش کی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی حیات و خدمات پر قومی سمینار

ممبئی (20 جون)۔ بزمِ اردو مہاراشٹر کالج، ممبئی اور ادارۂ ادبِ اسلامی کے اشتراک سے مہاراشٹر کالج کے محمد علی مِٹھا آڈیٹوریم میں ’علامہ شبلی نعمانی: حیات و خدمات‘ کے عنوان سے ایک قومی سمینار اور بعد ازاں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس علمی و ادبی پروگرام میں طلبہ، اساتذہ، شعرا، ادبا، صحافیوں اور ادب دوست سامعین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ سمینار کا آغاز بی اے سالِ دوم کے طالبِ علم مبشر شیخ کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ نظامت کے فرائض آصف شیخ نے انجام دیے۔ اپنے ابتدائی کلمات میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی حیات، علمی و ادبی خدمات اور اردو ادب میں ان کے منفرد مقام پر مختصر مگر جامع گفتگو کی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ادارۂ ادبِ اسلامی کے قومی صدر ڈاکٹر سلیم خاں نے کی۔ پہلا مقالہ معروف شاعر و صحافی عبداللہ ندیم نے بعنوان ’علامہ شبلی نعمانی اپنے خطوط کے آئینے میں‘ پیش کیا۔ دوسرا مقالہ معروف شاعر، صحافی اور کالم نگار شمیم طارق نے پیش کیا۔ انھوں نے سیرت النبیؐ کو شبلی کی علمی عظمت اور غیر معمولی تحقیقی صلاحیتوں کا روشن ثبوت قرار دیا۔ تیسرا مقالہ بزمِ اردو کے ڈائرکٹر اور شعبۂ اردو مہاراشٹر کالج کے انچارج ڈاکٹر محمد اظفر ریاض خاں نے بعنوان ’دار المصنّفین: ابتدا تا حال، علمی ورثہ، مالی بحران اور عصری تقاضے‘ پیش کیا۔ آخری مقالہ معروف صحافی اور محقق ڈاکٹر دانش ریاض نے پیش کیا جس میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کی تشکیل، عرب، شام اور ترکی کے اسفار اور ان اسفار کے نتیجے میں ایک عظیم علمی ادارے ... (بقیہ صفحہ 6 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : انتخاب مکاتیبِ شبلی
مرتب : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
اشاعت : 2024
قیمت : 116 روپے
ضخامت : 160 صفحات
ناشر : مغربی بنگال اُردو اکادمی، کولکاتا-700016
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر
E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

اُردو کے غیر افسانوی ادب میں مکتوباتی ادب کی اہمیت و افادیت ابتدا تا دم تحریر مسلم ہے۔مرزا غالب کو مکتوباتی ادب کا معمارِ اوّل تسلیم کیا جاتا ہے۔مکتوباتی ادبی سلسلے کو علی گڑھ تحریک میں بامِ عروج عطا کرنے والوں میں سرسیّد اور اُن کے رفقا نے کلیدی کردار ادا کیا۔علی گڑھ تحریک سے وابستہ علامہ شبلی نے بھی مکتوباتی ادب کو فروغ دینے میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔حالاں کہ علامہ شبلی نے اپنے تحریر کردہ مکتوبات میں غیر ملکی اسفار، تعلیم و تربیت، شعر و سخن پر گفتگو، ملکی و ادبی حالات پر تبادلۂ خیال کیا۔علامہ شبلی کے مکتوبات کو سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے 'مکاتیبِ شبلی' (پہلا حصہ) کو 1916 میں مطبع شاہی لکھنؤ سے شائع کیا۔'مکاتیبِ شبلی' کا دوسرا حصہ 1918 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔بقول محمد الیاس الاعظمی صاحب ان دونوں جلدوں میں خطوط کی تعداد 779 تھی۔اس کے بعد منشی امین زبیری نے 1926 میں 'خطوطِ شبلی' کو شائع کیا۔اس کے بعد ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے 2013 میں 'مکتوباتِ شبلی' کو ترتیب دیا۔اس کا دوسرا اڈیشن 2021 میں منظرِ عام پر آیا۔الیاس صاحب نے ہی نو دریافت مکاتیبِ شبلی کو 'افاداتِ شبلی' عنوان سے شائع کیا۔الیاس صاحب نے علامہ شبلی کے ذریعے عرب رسائل و جرائد اور مدیروں کے نام لکھے گئے مکتوبات کو 2016 میں 'مراسلاتِ شبلی' عنوان سے شائع کیا۔علامہ شبلی کے یہ خطوط علم و ادب کا سرچشمہ ہیں۔اس بنا پر پروفیسر خورشید الاسلام نے اپنی کتاب 'تنقیدیں' میں خطوطِ شبلی کو 'قومی اعمال نامہ' قرار دیا ہے۔

مکتوباتِ شبلی کے کئی اڈیشن شائع کرنے کے بعد الیاس صاحب کے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ علامہ شبلی کے مکتوبات میں سے ایک ایسا انتخاب تیار کیا جائے جن میں علم و ادب اور شعر و سخن کا کوئی خاص پہلو یا نکتہ بیان ہوا ہو۔الیاس صاحب نے زیرِ نظر انتخاب میں علامہ شبلی کے اُن خطوط کو شامل کیا جن میں مذکورہ باتوں اور امور پر قلمی گفتگو کی گئی ہے۔زیرِ نظر کتاب 'انتخاب مکاتیب شبلی' میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے مغربی بنگال اُردو اکادمی کی ایما پر خطوطِ شبلی سے انتخاب تیار کیا ہے۔الیاس صاحب نے کتاب کے دیباچے میں اس انتخاب اور خطوط کی اہمیت و افادیت پر اپنے مطمحِ نظر کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ مکاتیب نہ صرف علامہ شبلی کی 57 سالہ زندگی کی خود نوشت کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ ان میں ان کا عہد، ان کے عہد کے مسلمانوں کی علمی و ادبی زندگی زندہ و متحرک نظر آتی ہے۔علامہ نے جو علمی، ادبی، تعلیمی اور تصنیفی کارنامے انجام دیے یا جو تحریکیں برپا کیں ان کی پوری تاریخ ان کے قلم سے اس مکاتیب کے ذریعے سامنے آجاتی ہے۔''

(انتخاب مکاتیبِ شبلی، ص 9)

الیاس صاحب نے اس انتخاب میں علامہ شبلی کے 97 خطوط کو شامل کیا ہے۔اس انتخاب میں سب سے پہلا خط سرسیّد احمد خاں کے نام ہے اور آخری زہرا بیگم کے نام۔سرسید احمد خاں کے نام لکھے مکتوبات میں علامہ شبلی نے قسطنطنیہ اور استنبول کے بازاروں، مکتبوں، مدارس، درسگاہوں، یونی ورسٹیوں، لائبریریوں، چھاپہ خانوں، طریقِ تعلیم اور یہاں کے امرا سے ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے۔انھوں نے ان خطوط میں ہندوستان سے ترکی میں روپیہ بھیجنے کی باتیں رقم کی ہیں۔علامہ شبلی کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے ترکی کے کتب خانوں اور چھاپہ خانوں کے علاوہ یہاں دستیاب کتابوں کے بارے میں سرسیّد احمد خاں کو مطلع کیا ہے:

''قلمی کتابیں یہاں نہیں ملتی۔مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں۔اس لیے صرف مطبوعہ کتابیں خریدی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔یہاں امام غزالی کی تمام کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔مکاتبات کا نسخہ بھی ہے۔ بوعلی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی۔ ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں، لیکن کیا حاصل؟ کتابت کی شرح 4 روپے جز سے کسی حال کم نہیں۔معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں۔ عبدالقادر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں ...یہاں کا ٹائپ بے انتہا عمدہ ہے۔تمام دنیا میں اس کی نظیر نہیں۔علی گڑھ گزٹ کے لیے یا مستقل مطبع کے لیے خریدنا چاہیے۔بیروت و ہالینڈ کے حروف میں بھی یہ نوک پلک نہیں''۔(ایضاً، ص 15)

علامہ شبلی نے منشی امین زبیری کے نام 17 اپریل 1912 کو لکھے خط میں سیرۃ النبیؐ کے کام کی ابتدا اور دو برس سے زائد عرصہ میں اس کی تکمیل اور کان پور میں نومسلموں پر آریہ سماج کی تبلیغ پر تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔انھوں نے کان پور اور اس کے قرب وجوار کے قصبات و دیہات میں اصلاحی پروگرام کے انعقاد کی بات بھی رقم کی ہے۔خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں۔نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے۔اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، لیکن چوں کہ گرمی سخت ہو رہی ہے اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا۔اسی طرف سے بھوپال آؤں گا، پھر بنگلور یا بمبئی جاؤں گا، کتابیں ساتھ نہیں جا سکتیں، نہ اسٹاف ساتھ جا سکتا ہے، اس لیے سیرۃ النبیؐ کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا۔یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پا سکتا۔''

(ایضاً، ص 71)

20 اگست 1913 کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام لکھے خط میں علامہ شبلی نے کان پور کے حادثات و حالات سے متاثر ہو کر نظم لکھنے کے واقعے، کلکٹر کے ذریعے حسن نظامی کو اپنے دفتر میں بلانے کی روداد، کلکتہ آنے کی تفصیل اور عطیہ فیضی کے یہودی شوہر کے ذریعے علامہ شبلی کی تصویر کھینچنے کے بارے میں باتیں رقم کی ہیں۔اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی سیرۃ النبیؐ کو جلد از جلد مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن حالات اس قدر پیچیدہ ہوئے کہ اس کی جلدیں تیار ہونے میں تاخیر ہوتی گئی۔خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں علامہ شبلی نے اپنے حالات و کیفیت کا مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ اشتراک کیا ہے:

''یہ تو ظاہر ہے کہ اس وقت کان پور کے سوا کوئی آواز کچھ اثر نہیں رکھ سکتی، لیکن اب گورنمنٹ بھی سختی اور پامردی پر آمادہ ہے۔ہز آنر نے سفارت کو سوکھا جواب دیا، لکھنؤ میں اعانت کا جلسہ حکماً روک دیا گیا۔حسن نظامی وغیرہ کو کلکٹر نے بلوایا، میں نے ایک نظم مختصر کان پور کے متعلق زمیندار میں بھیج دی ہے، گو کسی قدر مؤثر ہے تاہم بہت احتیاط کی ہے۔کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے لیکن کیا کروں سیرت کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں لیے پھروں ... چوں کہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے، اس لیے ہر منٹ گراں معلوم ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پریس میں جا سکے ... ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے، میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے، ابھی پوری تیار نہیں ہو چکی، میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا۔'' (ایضاً، ص 85-84)

بہر نوع! ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے مداحینِ شبلی اور قارئین کی خدمت میں 'انتخاب مکاتیب شبلی' کا بیش قیمت تحفہ پیش کیا ہے۔انھوں نے اس انتخاب میں جس محنت شاقہ سے حواشی و تعلیقات درج کیے ہیں، اس سے ان خطوط کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔اس انتخاب میں جن مشاہیر کے نام علامہ شبلی نعمانی نے خطوط ارسال کیے ان میں ادبی مشاورت و ادبیت کے پہلو نمایاں ہیں۔علامہ شبلی نے جہاں اپنے پیش رؤں اور بزرگوں کے نام خط لکھتے وقت شائستگی واحترام کو مقدم رکھا وہیں اپنے خُردوں اور ہم عصروں کے نام لکھے مکتوبات میں بھی محبت و ایثار کا جذبہ عیاں کیا۔انھوں نے اپنے وقت کے ہندستان کے ملّی، تعلیمی، سیاسی و سماجی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔یہاں تک کہ شبلی کی ملازمت و اخراجات کے متعلق بھی اس انتخاب میں خطوط موجود ہیں۔بعض خطوط میں انھوں نے اس بات کا ذکر بھی کیا کہ انھوں نے سرسیّد کے ساتھ 16 برس گزارے لیکن سیاسی معاملات میں ان سے اختلاف رہا اور کانگریس کو ہمیشہ پسند کیا۔ندوہ اور نیشنل کالج کے قیام سے متعلق خطوط بھی اس انتخاب میں شامل ہیں۔اس موقعے پر راقم الیاس صاحب کو اس خوب صورت انتخاب کو شائع کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

◆◆◆

علامہ شبلی نعمانی کی حیات و خدمات پر قومی سمینار

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

کے قیام کے تصور پر روشنی ڈالی۔اختتامی کلمات میں صدرِ اجلاس ڈاکٹر سلیم خاں نے تمام مقالات پر اپنی قیمتی آرا پیش کیں اور مقررین کی علمی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔اس موقعے پر مرزا انور بیگ رائے بریلوی کی فکاہیہ تصنیف 'کھلتے ہیں گل یہاں' کی رسمِ اجرا عمل میں آئی۔

بعد ازاں مشاعرے کی صدارت معروف شاعر محمد اسلم غازی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض کہنہ مشق شاعر و ناظم یوسف دیوان نے انجام دیے۔مشاعرے میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں حسنین ساحل، مرزا انور بیگ رائے بریلوی، ڈاکٹر دانش ریاض، انس فیضی، ایڈوکیٹ زبیر اعظمی، عبداللہ مسرور، آصف شیخ، خان تسنیم کوثر، عظیم ملک، عبداللہ ندیم، محمد اسلم غازی، یوسف دیوان، صفیہ شریف، محمد حسین اور مسفرہ انصاری شامل تھے۔پروگرام کے اختتام پر عبداللہ مسرور نے رسمِ شکریہ ادا کی۔اس طرح یہ علمی و ادبی اجتماع خوشگوار یادوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ (روزنامہ ہندستان۔ممبئی)

◆◆

...زندہ لفظ کو بے جان کرنے کی فکری سازش...

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

اقتدار نہیں۔ Orientalist تحریک نے بھی یہی کیا۔ نولڈیکے، گولڈزیہر، وانسبر و، اور بعد میں کرومر نے قرآن کو 'متن' کے طور پر پڑھا تاکہ اس کی الہامی حیثیت کو چیلنج کیا جاسکے۔

تیسرا طبقہ، صارفیت اور سرمایہ دارانہ ثقافتی صنعت ہے جن کے لیے آج بھی 'کلام' بہت ہی خطرناک طاقت ہے، کیوں کہ وہ انسان کو بیدار کرتا ہے، اسے جھنجھوڑتا ہے، اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک بیدار انسان صارف بننے سے انکار کرسکتا ہے، نظام سے سوال پوچھ سکتا ہے۔ 'متن' محفوظ ہے کیوں کہ اسے پڑھا جائے، امتحان دیا جائے، نمبر لیے جائیں، اور پھر بھول جائیں۔ آج کا تعلیمی نظام بالکل یہی کرتا ہے۔ طلبہ شیکسپیئر کا 'متن' پڑھتے ہیں مگر اس کا کلام ان کے دل میں نہیں اترتا۔ حافظ کا 'متن' پڑھتے ہیں مگر اس کی مستی سے محروم رہتے ہیں۔ علامہ اقبال کا 'متن' نصاب میں ہے مگر اقبال کا کلام قوم کی رگوں میں نہیں دوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈگریوں کا رواج پڑ گیا، رٹا ازم اور لیکچر کلچر فروغ پا گیا لیکن علم سے سب دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس تمام معاملے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ ہے کہ 'کلام' کو 'متن' سے بدلنے کی فکری یلغار کا مقابلہ کرنا ان لوگوں کا کام تھا جو مذہبی اور ادبی تعلیم کے امین تھے، یعنی مدارس کے علما، یونیورسٹیوں کے ادبی اساتذہ، اور نقادانِ ادب، مگر ان میں سے کسی نے یہ سوال نہ پوچھا کہ 'کلام' اور 'متن' میں کیا فرق ہے اور یہ تبدیلی کیوں آئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہی علما اور مدرسین اقبالؔ پڑھاتے ہیں لیکن نہ خود کبھی سمجھے نہ کسی کو سمجھا پائے۔ مدرسوں کے بارے جو کچھ اقبالؔ کہتا ہے کیا آج تک اس سے کسی مدرس یا مدرسے نے شعور حاصل کیا ہے۔ میں جب ان مدرسین کے نام نہاد علمی درجے اور مصنوعی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی شعور کو چیلنج کرتا ہوں تو یہ کچھ سیکھنے کی بجائے اپنے دفاع میں لگ جاتے ہیں اور موضوع پر بات کرنے کی بجائے میری سرزنش کی طرف توجہ موڑنا چاہتے ہیں۔ میری کتاب اردو کی ادراکی تھیوری نے ان سب مدرسین کی بدیانتی کو ایسا بے نقاب کیا ہے کہ ان سے اپنا منہ چھپائے نہیں چھپ رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مدرّسین کی پوری تربیت مغربی علمی روایت کی بنائی ہوئی اصطلاحات میں ہوئی تھی اور ہو رہی ہے۔ انھوں نے Textual Criticism، Hermeneutics، Discourse Analysis اور Semiotics کو جوں کا توں قبول کرلیا کیوں کہ یہ بظاہر 'جدید' اور 'علمی' نظر آتی تھیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ ان کو جدید اور علمی و سائنسی بنا کر پیش کیا گیا۔ وہ نہ سمجھ سکے کہ ان اصطلاحات کے پیچھے ایک پوری سازشی نظریاتی عمارت ہے جو ان کی اپنی روایت کو کمزور کر دیتی ہے۔

مدارس میں قرآن آج بھی 'کلام اللہ' ہے، مگر عملاً اسے ایک مقدس متن کی طرح پڑھایا جاتا ہے، یعنی الفاظ یاد کرو، تجوید سیکھو، تفسیر رٹو، مگر یہ نہ سوچو کہ یہ کلام آج کے مسائل سے کیسے مخاطب ہے۔ کلام کا زندہ پن، اس کا خطابی اقتدار، اس کی تبدیل کرنے کی قوت، یہ سب غیر حاضر ہے۔

ادبی اساتذہ کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ اقبال کو 'متن' بنا کر پڑھانے والے بتائیں کہ ان کے کتنے طالبِ علموں کی زندگی اقبالؔ کے کلام سے بدلی؟ میرؔ کو 'متن' بنا کر پڑھانے والے بتائیں کہ کتنے طالبِ علموں نے میرؔ کو پڑھ کر ہجر کا درد محسوس کیا؟ کلام کو متن بنانے کے بعد استاد صرف ایک اطلاعات کا منتقل کرنے والا رہ جاتا ہے، تجربے کا واسطہ نہیں۔

پاکستان کی یونیورسٹیوں میں اردو ادب کے شعبوں کا المیہ یہ ہے کہ وہاں غزل 'متن' ہے، وہاں نظم 'متن' ہے، وہاں ناول 'متن' ہے۔ استاد 'متن' کا تجزیہ کرتا ہے، ساختیاتی، پس ساختیاتی، مابعد جدید؛ ہر قسم کا، مگر کلام کا جادو وہاں نہیں ہے۔ طالبِ علم ڈگری لے کر نکلتا ہے مگر ادب سے اس کے دل کا رشتہ نہیں بنا۔ یہ سانحہ صرف تعلیمی نظام کی ناکامی نہیں، یہ 'کلام کو متن بنانے' کا منطقی نتیجہ ہے۔

تاریخ میں ہر اس طبقے کو 'زندہ کلام' سے خطرہ ہوا جو طاقت پر قابض تھا۔ یہ ایک آفاقی اصول ہے۔

فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے خطرہ تھا کیوں کہ وہ کلام غلاموں میں بغاوت کی آگ لگاتا تھا۔ قریش کو قرآن کے کلام سے خطرہ تھا کیوں کہ وہ قبائلی اشرافیہ کی بالادستی کو چیلنج کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے سرداروں نے لوگوں کو قرآن سننے سے روکا اور کہا: 'لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ' کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور شور مچاؤ تاکہ آواز نہ سنائی دے۔ یہ کلام کی طاقت کا اعتراف تھا۔

اکبرِ اعظم کے دربار میں فیضی اور ابوالفضل نے دینی کلام کو 'متن' بنانے کی کوشش کی تاکہ اسے سیاسی طاقت کے تابع کیا جا سکے۔ اورنگزیب نے فقہ کو 'متن' کی طرح مرتب کروایا (فتاویٰ عالمگیری) کیوں کہ 'متن' کنٹرول ہوتا ہے، 'کلام' نہیں۔

برطانوی سامراج نے 1835 کے بعد جب فارسی تعلیم ختم کی اور انگریزی نصاب نافذ کیا تو اصل ہدف یہی تھا کہ نوجوانوں کو ان کے کلام سے کاٹ دو۔ سعدی، رومی، حافظ، ان کا کلام ان کی رگوں میں نہ دوڑے، وہ محض نصابی 'متون' بن جائیں۔ اور یہ منصوبہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔

بیسویں صدی میں جب ساحرؔ اور جالبؔ کی نظمیں زبان زدِ عام ہوئیں تو حکومت کو خطرہ ہوا، ساحرؔ کو ڈرا کر ملک سے نکال دیا گیا اور جالبؔ کو جیل ہوئی۔ یہ کلام کی طاقت تھی۔ جب بھٹو نے عوامی جلسوں میں کلام کیا تو جنرل ضیاء کو خطرہ ہوا۔ جنرل ضیاء نے بھری کانفرنس میں اختر حسین جعفری کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے تھریٹ کیا اور جعفری کی شاعری کو یونیورسٹیوں میں شجرِ ممنوعہ بنا کر رکھ دیا گیا اور مجید امجد جیسے کمزور شاعر کو اقبالؔ سے بڑا بنانے کی کوشش کی گئی۔

آج کے دور میں 'متن' کو ترجیح دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ متن کو Interpret کیا جا سکتا ہے، توڑا مروڑا جا سکتا ہے، اس کی 'مختلف قرأتیں' نکالی جا سکتی ہیں۔ کلام کو ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ جب کلام زندہ ہو، جب وہ براہِ راست دل سے دل تک پہنچتا ہو، تو اسے Mediate نہیں کیا جا سکتا، یعنی اس میں کوئی 'ثالث' نہیں گھس سکتا۔ ادارے، تفسیریں، کمیٹیاں، سب کلام کو متن بنا کر اپنی بالادستی قائم کرتے ہیں۔

ادراکیت کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ ہر تخلیقی عمل اور ہر تخلیقی پیداوار تین سطحوں پر انسانی ادراک کو متاثر کرتی ہے۔ اس تناظر میں 'کلام' ادراکیت کی سب سے مکمل تعریف پر پورا اترتا ہے جب کہ 'متن' ادراک کی صرف پہلی یا بمشکل دوسری سطح تک رسائی رکھتا ہے۔

ادراکیت کے نقطۂ نظر سے 'کلام کو متن بنانا' دراصل ادراک کی کمی ہے، یعنی Perceptual Reduction۔ یہ وہی عمل ہے جو موسیقی کو نوٹیشن [علامت] تک، مصوری کو رنگوں کی فہرست تک، اور محبت کو کیمیائی عمل تک محدود کر دیتا ہے۔ ہر چیز درست ہے مگر اصل سے محروم بھی ہے۔

کلام کی بحالی کے لیے ادراکیت یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ ادبی اور مذہبی تعلیم میں سب سے پہلے کلام کا تجربہ کرایا جائے، تجزیہ بعد میں آئے۔ پہلے غزل سنی جائے، پھر سمجھی جائے۔ پہلے قرآن کو کلام کی طرح سنا اور محسوس کیا جائے، پھر اس کی تفسیر پڑھی جائے۔ پہلے میر کا درد محسوس کیا جائے، پھر ان کی شاعری کا تجزیہ ہو۔ یہی ترتیب فطری ہے اور یہی ادراک کو زندہ رکھتی ہے۔ ورنہ آج ہر دوسرا شعری مخنث میر میر کرتا نظر آتا ہے لیکن درد تبھی محسوس کرتا جب اس کے پیٹ یا گھٹنے میں ہو۔

اس کے علاوہ ادراکیت یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ اصطلاحاتی سامراجیت کو چیلنج کیا جائے۔ 'Text' کو ہمیشہ 'متن' نہیں کہنا چاہیے، ہمیشہ 'کلام' کہنا چاہیے جب تجربے اور اثر کی بات ہو۔ یہ محض زبانی فرق نہیں، یہ ایک پوری نظریاتی بغاوت ہے جو ادراک کی زندگی کو واپس لانا چاہتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام نے 'متن' کو اس لیے پسند کیا کیوں کہ متن بکتا ہے، پیک ہوتا ہے، ڈیجیٹل ہوتا ہے، کمرشیل ہوتا ہے۔ کلام نہیں بکتا کیوں کہ اس کا تجربہ خریدا نہیں جا سکتا۔ کوئی پبلشر کلام کو پیک نہیں کر سکتا، کوئی الگورتھم کلام کو وائرل نہیں کر سکتا، کوئی اے آئی کلام نہیں بول سکتا۔

انسانی معاشروں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جتنا زیادہ 'متن' کی بھرمار ہوگی، اتنا ہی 'کلام' کی ضرورت بڑھے گی، کیوں کہ انسانی روح کو بدلنے کے لیے کلام چاہیے، متن نہیں۔ اور جب تک انسانی روح زندہ ہے، کلام زندہ رہے گا۔

ادراکیت کا یہ مقدمہ ہے کہ کلام کو واپس لایا جائے، نہ محض اصطلاح کے طور پر بلکہ ایک زندہ تجربے کے طور پر۔ مدارس میں، یونیورسٹیوں میں، گھروں میں، ادبی محفلوں میں۔ یہ صرف ادبی یا مذہبی سوال نہیں، یہ انسانی بقا کا سوال ہے۔

Mob. 03214468216

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میرؔ کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-

کلام سے متن تک

زندہ لفظ کو بے جان کرنے کی فکری سازش

ایک ادراکیاتی تحقیقی مضمون

ڈاکٹر فرحت عباس شاہ

انسانی تہذیب کی پوری تاریخ میں لفظ کبھی بھی محض علامت نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ ایک زندہ وجود رہا ہے، ایک ایسی قوت جو روح میں اترتی ہے، عقل کو جھنجھوڑتی ہے اور معاشرے کو اندر سے بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام آسمانی کتابوں، تمام عظیم شاعروں، تمام قدیم فلاسفروں نے لفظ کو 'کلام' کہا، یعنی وہ گفتگو جو زندہ ہو، جو سنے جانے کا تقاضا رکھتی ہو، جو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ قرآنِ کریم کو 'کلام اللہ' اور 'کلام الٰہی' کہا گیا۔ اردو، فارسی اور عربی شاعری کو 'کلام' کہا گیا۔ مولانا رومؒ کی مثنوی کو 'کلامِ رومی' کہا گیا۔ غالبؔ کے اشعار کو 'کلامِ غالبؔ' کہا گیا، علامہ اقبالؔ کی شاعری کو کلامِ اقبال لکھا اور پکارا گیا۔ یہ سب محض روایتی اصطلاح نہیں تھی، اس کے پیچھے ایک گہرا فلسفیانہ شعور کارفرما تھا۔

پھر اچانک بیسویں صدی کے وسط سے مذہبی اور ادبی نصابوں میں ایک خاموش مگر انتہائی خطرناک تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ 'کلام' کی جگہ 'متن' نے لے لی۔ Text نے Speech کو بے دخل کر دیا۔ زندہ لفظ کو بے جان کر دیا گیا، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ مذہبی اور ادبی مدرّسین نے اس تبدیلی کو سوال کرنا تو درکنار، محسوس تک نہ کیا۔ یہ مضمون اسی 'ادراکی تبدیلی' کو بے نقاب کرنے کی کوشش ہے، اس سوال کے ساتھ کہ یہ تبدیلی کب ہوئی، کس نے کی، اور سب سے اہم، کیوں کی گئی اور اس سے کس طبقے کو فائدہ پہنچا۔

ادراکیت کے نظریے کی روشنی میں 'کلام' کو تین سطحوں پر سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلی سطح حسی ادراک کی ہے، یعنی وہ آواز جو کان میں پڑتی ہے اور جسمانی ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ دوسری سطح جذباتی ادراک کی ہے، یعنی وہ اثر جو دل پر پڑتا ہے اور کیفیت پیدا کرتا ہے۔ تیسری سطح عقلی و سماجی ادراک کی ہے، یعنی وہ شعور جو معاشرے کو بدلنے پر آمادہ کرتا ہے۔ 'کلام' تینوں سطحوں پر بیک وقت کام کرتا ہے۔ اسی لیے جب قرآن نازل ہوا تو عرب کے سخت دل سن کر روتے تھے، جب غالبؔ نے غزل کہی تو سننے والے بے قرار ہوئے، جب اقبالؔ نے نظم لکھی تو لوگوں کو فکری بنیادیں نصیب ہوئیں اور جب ساحرؔ نے مزاحمتی کلام لکھا تو تخت لرزتے نظر آئے۔

'متن' اس کے برعکس صرف پہلی سطح پر کام کرتا ہے، یا بمشکل دوسری سطح تک پہنچتا ہے۔ متن پڑھا جاتا ہے، محسوس نہیں کیا جاتا۔ متن کا تجزیہ ہوتا ہے، اثر نہیں۔ متن کو Decode کیا جاتا ہے، جذب نہیں کیا جاتا۔ (ڈی کوڈ کرنے کی تکنیک کو بھی نہ صرف رواج دیا گیا بلکہ اس کے اکیڈمک مرتبے کا تاثر بھی پیدا گیا)۔

یونانی فلسفے میں بھی اس فرق کو خوب سمجھا گیا تھا۔ افلاطون نے اپنے مکالمے 'فیدرس' میں سقراط کی زبانی کہلوایا کہ تحریر (متن) اصل علم نہیں دیتی کیوں کہ وہ جواب نہیں دے سکتی، وہ مردہ ہے۔ اصل علم وہ ہے جو زندہ گفتگو (کلام) سے روح میں اترے۔ ارسطو نے بھی 'ریٹورک' میں Logos (منطق)، Ethos (کردار) اور Pathos (جذبہ) کو یکجا کرنے والی گفتگو کو بالاتر مانا۔ یہ تینوں عناصر 'کلام' میں ہوتے ہیں، خالص 'متن' میں نہیں۔

عربی لسانیات میں 'کلام' کی تعریف 'لفظ مفید' سے کی گئی ہے، یعنی وہ لفظ جو فائدہ دے، جو اثر ڈالے، جو مکمل ہو۔ سیبویہ سے لے کر ابنِ جنّی تک تمام عربی نحویوں نے 'کلام' کو ایک زندہ ابلاغی عمل کہا جب کہ محض حروف اور الفاظ کو 'قول' یا 'لفظ' کہا جو 'کلام' سے کمتر درجہ رکھتے ہیں۔

اسی روایت میں قرآنِ کریم کا نام 'کلام اللہ' رکھا گیا۔ یہ محض 'اللہ کی تحریر' نہیں، یہ 'اللہ کا زندہ خطاب' ہے، جو ہر پڑھنے والے سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے، جو ہر دور میں نئے معنی کھولتا ہے، جو سینے میں اترتا ہے نہ کہ صرف آنکھوں سے گزرتا ہے۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ یہ قاطع قول ہے، فیصلہ کن کلام ہے۔ یہ وصف کسی 'متن' کا نہیں ہوسکتا۔

'متن' یعنی Text کا تصور مغربی تنقیدی روایت میں بیسویں صدی کے وسط میں ابھرا اور پھر تیزی سے دنیا بھر کے علمی اداروں میں پھیل گیا۔ اس کے پیچھے کئی مصنوعی فلسفیانہ تحریکیں اور من گھڑت تھیوریاں کارفرما تھیں۔

ساختیات (Structuralism) کے علمبردار فرڈینںڈ نے زبان کو ایک بند نظام کہا جس میں Signifier (لفظ) اور Signified (مفہوم) کا تعلق من مانا اور بے جان ہے۔ اس نظریے نے لفظ کو اس کی سماجی، روحانی اور تاریخی جڑوں سے کاٹ دیا۔ لفظ اب ایک نشان (Sign) تھا، کوئی زندہ حقیقت نہیں۔ اسی بنیاد پر رولاں بارت نے 1967 میں اپنا مشہور مضمون 'مصنف کی موت' (The Death of the Author) لکھا جس میں کہا گیا کہ کوئی بھی تحریر اپنے مصنف سے الگ ہو جاتی ہے اور قاری جو چاہے معنی نکالے۔ یہاں کلام کو متن بنانے کا سب سے بڑا فلسفیانہ وار ہوا۔

پس ساختیات (Post-Structuralism) اور خاص طور پر ژاک دریدا نے 'گرامیٹولوجی' میں یہ دعوا کیا کہ تحریر (Writing) گفتگو (Speech) سے اعلا ہے کیوں کہ گفتگو میں مصنف کی 'موجودگی' کا وہم ہوتا ہے جو حقیقت نہیں۔ اس نے مغربی فلسفے کی پوری روایت کو 'صوت مرکزیت' (Logocentrism) اور 'موجودگی کی مابعدالطبیعیات' (Metaphysics of Presence) کا شکار قرار دے کر رد کر دیا۔ دریدا کا یہ نظریہ بظاہر فلسفیانہ تھا مگر اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ کلام کی بالادستی ختم ہوئی اور متن سب کچھ بن گیا۔

نئی تنقید (New Criticism) نے بھی یہی راہ اختیار کی۔ ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز اور کلینتھ بروکس نے کہا کہ ادب کا تجزیہ 'خود متن' تک محدود ہونا چاہیے، نہ مصنف کی نیت اہم ہے نہ تاریخی سیاق، صرف الفاظ کی ترتیب اور ان کے باہمی تعلقات۔ یہ نقطۂ نظر Intentional Fallacy اور Affective Fallacy کے نام سے مشہور ہوا۔ نتیجتاً شاعری بھی 'متن' بن گئی، اور شاعر کا درد، اس کا تجربہ، اس کی زندگی، سب غیر متعلق قرار پائے۔

یہ تبدیلیاں 1950 سے 1980 کے درمیان مغربی یونیورسٹیوں میں پختہ ہوئیں، اور پھر نوآبادیاتی تعلیمی نظام کے ذریعے پوری دنیا کے ادبی اور مذہبی نصابوں میں سرایت کر گئیں۔ پاکستان، ہندستان، مصر، ایران، ترکی، ہر جگہ یونیورسٹیوں میں 'متنیاتی تجزیہ' (Textual Analysis) لازمی ہوا اور 'کلام کی تفہیم' ثانوی یا غیر ضروری قرار پائی۔

ادراکیت یہ سوال اٹھاتی ہے کہ جب کوئی فکری تبدیلی آتی ہے تو اس سے کس کو فائدہ ہوتا ہے اور کس کو نقصان؟ جس کا جواب ہمیں تاریخ یہ دیتی ہے کہ کلام کو متن سے بدلنے سے فائدہ تین طبقوں کو ہوا۔

پہلا طبقہ سامراجی اور نوآبادیاتی قوتیں ہیں۔ جب انگریز برِصغیر پر قابض ہوئے تو انھیں معلوم تھا کہ قرآن اور شاعری کا کلام عوام کو اندر سے بدل سکتا ہے، انھیں بغاوت پر آمادہ کرسکتا ہے۔ 1857 کے بعد انگریزوں نے برِّصغیر کو فارسی لسانی تہذیب سے کاٹنے کے لیے اردو کا بول بالا کیا۔ فورٹ ولیم کالج میں بنائے گئے سسٹم کے ذریعے زبان، ادب، نصاب اور مدرس کو کنٹرول کرلیا جب کہ مذہبی تعلیم کو 'روایتی' اور 'غیر علمی' قرار دے دیا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب قرآن کو 'متن' بنا دیا جائے، جب اس کا زندہ خطابی کردار ختم کر دیا جائے، تو وہ محض ایک تاریخی دستاویز بن جاتا ہے جس سے ذاتی یا سیاسی قوت نہیں ملتی۔ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کا اصل ہدف یہی تھا کہ مقامی آبادی کو ان کے 'کلام' سے کاٹ دیا جائے۔

اس متنی سازش کے دوسرے بینیفشری کے طور پر سیکولر اشرافیہ اور علمی ادارے سامنے آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے مغربی علمی ادارے وہ تھے جہاں مذہب پہلے ہی سے مشکوک تھا۔ ان اداروں کو 'کلام اللہ' کا تصور قبول نہیں تھا کیوں کہ وہ کسی الہامی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اگر قرآن محض ایک 'متن' ہے تو وہ کسی بھی دوسرے ادبی یا تاریخی متن کی طرح تجزیے کا موضوع ہے، اس کا کوئی روحانی ... (بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***